بے بس اور لاچار

(ناولٹ)



پرنس آف ہارٹس
ڈاکٹر سید بلال آل ارمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بے بس اور لاچار

(ناولٹ)

پرنس آف ہارٹس

ڈاکٹر سید بلال آل ارمان

انتساب

پیاری ماں کے نام جو میرے لئے بہت کچھ ہے۔

بے بس اور لاچار

''اس کا شوہر آٹو رکشا ڈرائیور تھا، اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو کر چل بسا۔ شوہر کی کمائی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ روزگار نہ تھا۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم کا مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ جب کئی دن تنگی اور پریشانی کے گذرے تو اس نے یہ عجیب وغریب ارادہ کر لیا۔ ٹوٹے پھوٹے آٹو کی مرمت کروائی اور اس طرح وہ اس شہر کی پہلی خاتون آٹو رکشا ڈرائیور بن گئی۔ آج جو سبق ہم پڑھنے جا رہے ہیں اسی خاتون کے متعلق ہے''۔ یہ کہہ کر میں نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کلاس کی ذہین ترین طالبہ نغمہ بول پڑی۔

''سر! عورت کیسے آٹو رکشا ڈرائیور بن سکتی ہے؟'' کلاس میں موجود طالبات کے چہروں پر بھی وہی سوال لکھا ہوا تھا۔

''بالکل بن سکتی ہے، ہمارے شہر میں بھی چند عورتیں آٹو چلاتی ہیں۔ یہ چیز ابھی عام نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے طالبات کو سمجھانا شروع کیا۔ ''لیکن جس شہر کی یہ کہانی ہے۔ وہاں پہلے کبھی کسی عورت کو آٹو چلاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ حالات انسان سے کیا نہیں کرواتے۔ پہلے تو اس پیشے میں موجود مرد ڈرائیوروں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ فقرے کسے، لیکن وہ عورت بھی دھن کی پکی نکلی۔ زندگی کی جو جنگ اس نے لڑی وہ آج آپ کے لئے ایک سبق بن گئی ہے''۔

''سر! آپ کے لئے فون ہے۔'' چپراسی دروازے پر کھڑا تھا۔

میں نے ان بچوں کو سبق پڑھنے کے لئے کہا اور آفس کی طرف چل دیا۔ ''ہیلو! بھائی صاحب! میں کب سے کانٹکٹ کر رہا ہوں فون لگ ہی نہیں رہا تھا'' فون پر بہلو تھا۔ اپنے مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ۔

”ہاں، میرا فون دو دن سے خراب ہے، سب ٹھیک تو ہے؟“

”نہیں بھائی صاحب۔ ایک بری خبر ہے، ایک کیا دو بری خبر ہے۔ صائمہ باجی کا انتقال ہوگیا۔

”اوہ! انا للہ و انا الیہ راجعون“۔

”آپ کو فون کیے تھے مگر نہیں لگا۔ پھر اشرف ماسٹر سے اسکول کا نمبر لے کر لگایا، اور جب باجی کو قبرستان لے کر گئے اور واپس آئے تو نانی جان کا بھی انتقال ہوگیا۔ آج مغرب کی نماز کے بعد تدفین ہوگی، آپ آرہے ہو نا؟“

یا خدا! مجھے لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی ہو اور پورا کمرہ گھومنے لگا۔ اچانک دو دو موتیں۔

ایک گھنٹہ بعد میں منالی جانے والی بس میں کھڑکی سے سر لگائے بیٹھا باہر تیزی سے بھاگتے مناظر کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ماضی کے سارے واقعات کسی فلم کے اسکرین کی طرح میرے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگے۔ صائمہ باجی ہمارے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ بچپن ہی سے میں انھیں خالہ کہا کرتا تھا۔ دبلی، پتلی، شیریں لہجہ اپنائیت سے لبریز، ایسا محسوس ہوتا جیسے سرتاپا شفقت میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ ایک چھوٹے سے مکان میں وہ رہا کرتی تھیں، پھر جب ساجد سے ان کی شادی ہوگئی تو ہمارے پڑوس میں آکر رہنے لگیں۔ ان کی والدہ جنھیں ہم نانی کہا کرتے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اسی ضلع کے ایک چھوٹے سے قصبے مدنا پور میں ان کی پرورش ہوئی تھی، وہیں تعلیم حاصل کی اور پھر ہمارے گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں ان کا تقرر ہوگیا۔ ایک محنتی، ذہین اور شریف استانی کی حیثیت سے انھوں نے بچوں اور بستی والوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ مجھے کسی نے ان کے متعلق بتایا تھا کہ مدنا پور میں ان کے والد محنت مزدوری کر کے گذر بسر کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی کھیت میں بارش کے دوران پیڑ کے نیچے کھڑے تھے کہ اچانک اس پیڑ پر بجلی گر پڑی اور وہیں ختم ہو

گئے۔ پھر حالات کی نہ جانے کتنی بجلیاں ان کے پس ماندگان پر گریں۔ نانی جان نے بڑے صبر کے ساتھ خالہ جان اور ان کے بھائی عرفان کو پال پوس کر بڑا کیا۔ ایک غریب بیوہ کے راستے میں جو مصیبت کے پہاڑ آسکتے ہیں وہ سب انھوں نے ہمت کے ساتھ طے کئے۔

وقت کے ساتھ عرفان کمانے کے لائق ہوا تو انھوں نے اسے ایسے دیکھنا شروع کیا جیسے وہ آنگن میں لگے بور سے لدے مہکتے ہوئے آم کے پیڑ کو دیکھا کرتی تھیں جس میں اس بار پہلی مرتبہ پھل آنے والے تھے۔۔ عرفان کی شادی ہوئی اور چاندسی دلہن گھر آئی۔ ان ہی دنوں ایک رات کچھ ایسی زبردست ہوا چلی کہ آم کا سارا بور زمین پر بچھ گیا۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی بہو نے اس گھر میں ماں بیٹی کا رہنا دشوار کردیا۔ عرفان کی بیوی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ دونوں عرفان کی محدود کمائی پر بوجھ ہیں۔

چند ماہ گذرے ہوں گے کہ بیوہ کی دعاؤں اور آنسوؤں نے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ ہمارے گاؤں میں صائمہ خالہ کا تقرر ایک پرائمری اسکول میں ہوگیا۔ وہاں ایک کرائے کا مکان لے کر وہ دونوں ماں بیٹی رہنے لگے۔ ملازمت کرتے ہوئے دو تین برس گذرے ہوں گے کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے ساجد سے صائمہ خالہ کا نکاح ہوگیا۔ ہم ساجد صاحب کو کسی حد تک جانتے تھے اس لئے اس خبر سے ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، شادی کے بعد ساجد صاحب نے پر پرزے نکالنے شروع کردئے۔ انھوں نے تو صائمہ خالہ کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ کر نکاح کیا تھا۔ ہمارے سماج میں اب سروس والی بیوی سے شادی کرنا بھی تلاشِ روزگار کی ایک مقبول قسم ہے۔

بیوی کی کمائی ہاتھ لگی تو ساجد صاحب کا ہاتھ کھل گیا۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے شراب اور بازاری عورتوں کے چکر میں پھنس کر اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھانا شروع کردیا۔ صائمہ خالہ خاموشی سے وہ سارے مظالم سہتی رہیں۔ ان کی بے بسی اور خاموشی نے ساجد صاحب کے حوصلے بڑھادیے۔ نانی نے

ان کی حرکتوں کے خلاف آواز اٹھائی گمران کی آواز میں وہ طاقت کہاں تھی کہ ساجد صاحب کا ہاتھ روک لیتی۔ وہ بذاتِ خود داماد کے گھر میں پناہ گزیں تھیں۔ بیٹے کے گھر کی دہلیز پھلانگ کر آئی تھیں، اس طرف کا راستہ بند تھا۔ لے دے کر بیٹی کی تنخواہ کا ایک سہارا تھا اور وہی اس گھر میں ان کے رہنے کا جواز بھی تھا۔ ساجد صاحب بھی اس بات کو خوب جانتے تھے کہ نانی کو الگ کر دینے سے وہ لکڑی ٹوٹ جائیگی جس پر انھوں نے اپنے عیش و عشرت کا آشیانہ بنایا تھا۔ صائمہ خالہ زندگی بھر ایک لدی ہوئی شاخ کی طرح جھکی رہیں۔

میرے آب و دانے نے مجھے اس زمین سے کسی پودے کی طرح اکھاڑ کر شہر کا حصہ بنا دیا تھا۔ گاہے بگاہے ان لوگوں کی خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ بھلو بھی کبھار شہر آتا تو میرے گھر بھی چلا آتا۔ اسی کے ذریعے ایک دن مجھے پتہ چلا کہ ساجد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور ایک نیا گھر بنا کر نئی بیوی کو اس وہاں رکھ چھوڑا ہے۔ پھر ایک سال بعد خبر ملی کہ صائمہ خالہ کو بلڈ کینسر ہو گیا۔ بوڑھی نانی کے مقدر میں نہ جانے اور کیا کیا لکھا تھا۔ ذہنی طور پر بھی اس خبر کے لئے تیار رتھے کہ صائمہ خالہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔

اپنی مٹی سے دور ہونے کی ایک جان لیوا کسک جو شہر کے ہنگاموں میں ایسے چھپ جاتی ہے جیسے بارش کی پہلی بوچھار سے گاؤں کی کچی سڑکوں پر اڑتی دھول دب جاتی ہے، اب پھر ابھر آئی تھی۔ بس دھیرے دھیرے اس بستی کے جانے پہچانے راستوں پر رینگ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو گویا میں اپنے ماضی کے شہر میں داخل ہو رہا ہوں۔ گاؤں کے راستے اب بھی ویسے ہی تھے، دھول اڑاتے ہوئے۔ لوگوں کو چہروں پر وقت اپنے سفر کے نشان چھوڑ گیا تھا۔ بس دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسٹیشن قریب آیا تو میں نے اپنا بیگ اور خود کو سنبھالا اور بس رکتے ہی نیچے اتر آیا۔ پہلے یہی قصبہ صائمہ خالہ اور نانی جان کے وجود سے کے ساتھ بھرا بھرا لگتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دونوں اپنے ساتھ اس قصبے

کی ساری رونقیں سمیٹ کر لے گئے۔

صائمہ خالہ کے گھر پہنچا تو نانی جان کو غسل دیا جا چکا تھا۔تھوڑی ہی دیر میں لوگ جنازہ لے کر قبرستان کی طرف چلنے لگے۔صائمہ خالہ کے پہلو ہی میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔اسی دوران مجھے پتہ چلا کہ جب صائمہ خالہ کا جنازہ اٹھایا گیا تو نانی جان لڑکھراتی ہوئی دروازہ تک آئیں اور اشکبار نظروں سے بیٹی کے جنازہ کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔جب لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک چیخ مار کر یہ کہا:''بیٹی صائمہ!اب میں اس گھر میں کس منہ سے رہوں گی؟''اور پھر وہ ایک کمزور مکان کی طرح وہیں ڈھے ہوگئیں۔انھیں اٹھا کر وہیں بستر پر لٹا دیا گیا اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آئیں۔

دوسرے دن مجھے اپنے شہر روانہ ہونا تھا۔میں جب بس اسٹاپ پر پہنچا تو دیکھا اس چھوٹی سی بستی میں بڑی بڑی عمارتیں سر اٹھانے لگی تھیں۔اب اس گاؤں کے اندر سے ابھرتے ہوئے عفریت جیسے شہر نے اس بستی کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔میرے قریب سے ایک آٹو رکشا گذرا جسے ایک عورت چلا رہی تھی۔شہر کی طرح یہ مجبوریاں اب قصبوں میں داخل ہو چکی تھیں۔مگر یہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

مجھے حیرت سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے ببلو نے کہا۔''بھائی جان!عورتیں آجکل بہت ترقی کر لی ہیں،ادھر گاؤں گاؤں میں عورتیں آٹو چلانے لگی ہیں۔''

میری آنکھوں کے آگے صائمہ خالہ کا چہرہ آگیا جو ملازمت ملنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھیں۔پھر لڑکھڑاتا ہوا نانی جان کا ہیولہ ابھرا اور گر کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

''ببلو!عورت چاہے آٹو چلائے یا ہوائی جہاز،دنیا والے عورت کی ترقی کے کتنے ہی افسانے بنا ڈالیں حقیقت یہ ہے کہ عورت آج بھی اتنی ہی بے بس اور لاچار ہے جتنی کل تھی۔''

☆ختم شدہ☆

اِس خاک کو معاف کر دے اے اللہ

ارمانؔ اب اُس خاک میں جا ملنے کو ہے

ڈاکٹر سید بلال ارمان